چوہدری محمد یوسف ایڈووکیٹ

کارنیلیس ـــــــ انسداد جرم پر اسلامی حدود و تعزیر کے حوالے سے

زیر نظر مقالہ کے تمام مندرجات مکمل طور پر اسلامی نقطۂ نگاہ کہلانے کے مستحق نہیں' بالخصوص قطع اعضاء کی متبادل صورت اور مقالہ کی آخری سطروں کا اسلامی قانون سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہرحال غور و فکر کے دوسرے پہلوؤں کے پیش نظر اس مقالہ کو شائع کیا جارہا ہے۔

اسلامی حدود و تعزیرات کی حکمت سے ناواقف ان سزاوں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر اے آر کارنیلیس کی تقاریر اور مضامین کی ترتیب کے دوران اس موضوع پر ان کے دو مقالات میرے لئے زبردست استفادہ کا باعث ہوئے۔ قارئین کو شریک استفادہ کرنے کے لئے میں نے ان کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ وہ ایک مربوط مضمون بن جائیں۔ میرے ربطیہ جملوں کے علاوہ موصوف کے مقالات سے اقتباسات کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ اصل سے استفادہ کے لئے حوالے درج کر دئے گئے ہیں۔ آج جب کہ اسلامائزیشن کا عمل اپنی راہ کا متلاشی ہے' یہ کاوش دلچسپی کا باعث ہوگی۔

دنیائے قانون کے ماہرین نے انسداد جرم کے بارے میں جو فکری کاوشیں کی ہیں وہ ناکام اور غیر موثر ثابت ہوئی ہیں۔ انسانی فطرت میں ودیعت شدہ برائی نیکی پر غالب رہی ہے۔ برائی کے ارتکاب میں انسان نے بلا کی ذہانت استعمال کی ہے۔ جرم کے نت نئے طریقے ایجاد کئے گئے۔اور پھر ان پر عمل کرنے میں وہ اور بھی جری واقع ہوا۔اسکے بر عکس نیکی کو عزیز رکھنے والے انسداد جرم کیلئے پیشگی تدبیر سوچنے اورانسدادی اقدام کرنے میں کوتاہ عمل رہے ہیں۔اسی کا نتیجہ ہے کہ جرائم کی رفتار پر کوئی روک موثر نہیں ہوئی۔ دراصل انسانی فکر انسدادی واقعہ ہی نہیں ہوئی۔ جرم اپنی قبیح ترین اور ناقابل تصور شکل میں رونما ہو جاتا ہے تو اسکے سدباب کی سوچ اپنا کام شروع کرتی ہے۔ سوچ کا یہ مرحلہ ابھی ناتمام ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کی نئی اور قبیح تر صورت سامنے آ جاتی ہے۔ اسطرح نیکی برائی کے تعاقب میں کم از کم دو قدم پیچھے رہتی ہے۔ چند سال پہلے تک مستورات کو سرعام برہنہ کرکے مجبور رقص کرنے کا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسکی ابتدا نواب پور کے واقعہ سے ہوئی۔ جسکے بعد ایسا گھناونا جرم ایک معمول بنتا جا رہا ہے۔

اسی طرح میت کو قبر سے نکال کر اسکے ساتھ بدکاری کی مثال کم از کم برصغیر کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مگر انسانی ذہن اتنی پستی تک گیا۔ اب ایسی قبیحات کا پیشگی تصور کرنا اور ارتکاب جرم سے پہلے اسکی موثر سزا مقرر کرنا انسانی فکر کی حدوں سے باہر ہے۔ جرم و برائی کے انسداد کیلئے نیکی کو برائی سے دو قدم آگے آنا پڑیگا۔ بھلائی کی اس پیش قدمی کی ایک ہی صورت

ہے کہ انسان اپنے خالق حقیقی کی عطا کردہ راہنمائی قبول کرے۔ شیطانی فکر کا توڑ رحمانی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس حقیقت کے اعتراف میں انسان نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔ مروجہ قانون جرم و سزا کی ناکامی کا اظہار جسٹس کار نیلیس ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"صاف بات ہے کہ جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کے تمام اقدامات ناکام ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان اقدامات کے بارے میں نئے سرے سے غور کی ضرورت مسلمہ ہے۔ اس بارے میں قدما کے تجربات کو "قدامت" کے طعنہ کے تحت مسترد کر دینا اچھا نہیں۔" (۱)

زندگی میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ ماضی سے بیزاری کو فکر کی بنیاد بنا لینا کسی طرح معقول نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر کی "معراج" یہ ہے کہ آج بھی وہ مردوں کو جلاتا ہے، پیشاب پیتا ہے اور سر عام برہنہ پھرتا ہے۔ رنگ نسل میں امتیاز کرتا ہے۔ دولت کو وجہ افتخار سمجھتا ہے۔ پستی کی اس سطح پر رہ کر قدامت پسندی پر طنز کسی طرح زیبا نہیں۔ عہد قدیم میں مذہبی اثرات کے تحت اگر کوئی قابل قدر چیز ملتی ہے تو اسے قصہ ماضی قرار دے کر رد کرنا درست نہیں۔ ماضی سے تعصب غیر معقول ہے۔ یہ فکر کی بلندی نہیں پستی ہے۔ صحتمند فکر ماضی کے تجربہ سے استفادہ کر کے مستقبل کیلئے راہ متعین کرتی ہے۔ آج جبکہ انسداد جرم کی کوششیں اسکی افزائش کا سبب بن گئی ہیں تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ماضی کے تجربات کی روشنی میں نظام جرم و سزا پر نظر ثانی کی جائے۔

جرم و سزا کے سلسلہ میں جرم کی تعریف تفتیش سماعت اور سزا کی نوعیت بے حد اہم ہے۔ جرم کی تعریف میں بنیادی کوتاہی یہ ہے کہ اسے دیوانی ضرر کی حد سے مملکت اور معاشرہ کے خلاف تعبیر کرتے ہوئے شدید مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ مملکت کو جرم کے خلاف مدعی کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ بنیادی غلطی ہے۔ کار نیلیس کے مطابق:

"میرے خیال میں برطانوی انصاف کے تصور میں غلطی یہ ہے کہ معمول کے جرائم کو تفتیش سماعت میں مملکت کی ایجنسیوں کے دائرہ کار کے تحت لانے میں زیادتی ہوئی ہے۔" (۲)

اس طرح پولیس اور عدالت کے دائرہ کار نے جرم کا احاطہ کیا۔ حالانکہ بقول جسٹس کار نیلیس:

"بہت سے معاملات میں پولیس اور مجسٹریٹ کی مداخلت سے احتراز کیا جا سکتا ہے۔" ہمارے مخصوص حالات کے پیش نظر معاملات کو مملکت کی سطح کی بجائے مقامی طور پر طے کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں سے زیادہ کا اثر محدود علاقہ تک ہے۔ وجہ یا سطح کے معاملات طے کرنے کا یہ زیادہ موثر انداز ہے۔" (۳)

"ہمارے وطن میں تمام جرائم کا ارتکاب معمول کے جذبات کے ماتحت ہوتا ہے۔" (۴)

"جہاں بڑے جرائم' قتل' اغوا مویشیوں کی چوری اور رہزنی کا ارتکاب خاندانی دشمنی اورعزت و وقار کی خاطر ہوتا ہے۔ پھر آبادیوں کی نوعیت یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی بستیوں کی شکل میں لمبی مسافتوں کو درمیاں لئے ہوئے منتشر صورت میں ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان پر قبائل اور برادریوں کے ذریعے موثر چودراہٹیں اور سرداریاں قائم ہیں۔ایسے میں پولیس کیلئے کسی رپورٹ شدہ جرم کی تفتیش میں قانونی معیار پر پورا اترنے والے شواھد اکٹھا کرنا بے حد مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ دیہات میں آبادیوں کا ایسا نظام موجود ہے کہ جس میں مرتکبین جرم کی شناخت کے بارے میں مقامی اطلاع مکمل اور درست ہوتی ہے۔"(۵)

"موجودہ نظام کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ ہر فوجداری کیس کا فیصلہ اسی نوعیت کے کئی مقدمات کو جنم دینے کا باعث ہے۔ عدالتیں کھلی عدالت میں پیشکردہ ایسی شہادت پر انحصار کرتی ہیں جو حلف پر لی جاتی ہے حالانکہ اس حلف کی کوئی وقعت نہیں۔ علاوہ ازیں وہ شہادت کے ایسے کڑے معیار کو اختیار کرتی ہیں جن میں سے بعض حقیقت معلوم کرنے کے لئے بڑے اہم ہو سکتے ہیں مگراسکا بہرحال نتیجہ قصور واروں کی بریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسکے علاوہ ایسے مقدمات کی بڑی تعداد ہے جن میں بے گناہ سزائے موت تک پا جاتے ہیں۔ قصور وار کی بریت یا بے گناہ کی سزایابی' دونوں صورتیں' انتقام اور دشمنی کے بیج بو دیتی ہیں۔"(۶)

فوجداری نظام میں کار نیلیس کے نزدیک:

"ملزم کو بہرصورت بیگناہ تصورکیا جاتا ہے۔ جملہ قیاسات کو اسی کے کھاتہ میں ڈالا جاتا ہے اور تمام تر بار ثبوت جو کہ اعلی ترین فنی ضوابط کے ماتحت جانچ کر قبول کیا جاتا ہے' استغاثہ کے ذمہ ہوتا ہے۔" (۷)

"یہ سب کچھ موجودہ فوجداری قانون کو جرم کے خاتمہ میں ناکام بنا دیتا ہے۔ان حالات میں ہی سوچنا پڑتا ہے کہ فراہمی انصاف کا فرض لوگوں کے ہاتھ میں کیوں نہ دے دیا جائے۔" (۸)

"مقامی طور پر اہم تر بات یہ ہے کی امن اور سکون قائم رہے۔ اسکے لئے اکثر مقدمات میں سزاوں کی وجہ سمجھ میں آ سکتی ہے۔اس بارے میں قانونی اور فنی ضوابط کا بہت زیادہ لحاظ کرنے کے بجائے ملزم کی کوتاہی کا تعین اسے مائل بہ اصلاح کرنیکی صورت گری'مقامی امن و سکون کی بحالی اور ستم رسیدہ کی دادرسی کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔" (۹)

"یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مقامی طور پر ستم رسیدہ شخص کی داد رسی کو ملزم کی سزایابی کے مقابلے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ قانون اپنے سارے عمل کو ملزم کے خلاف

مرکوز کر دیتا ہے۔ متاثرہ شخص کو معاوضہ دلائے جانے کا تو وہاں کوئی تصور ہی نہیں۔ در اصل مقامی رواج جرم کو دیوانی نوعیت کا ضرر خیال کرتا ہے۔" (۱۰)

"اس مرحلہ پر یہ بات طے طلب ہے کہ رواج کب، کیسے اور کس درجہ میں قانون کو راہ دیدے۔ یہ فیصلہ ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بارہ میں مروجہ ضوابط قانون کی پیروی ضروری نہیں۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے قانون کسی بھی سوسائٹی کے اندر سے جنم لیتا ہے۔ فی الواقع یہ سوسائٹی کی شخصیت عامہ کا اظہار ہے۔ ایک سوسائٹی کے اصولوں کا اس سے مختلف سوسائٹی پر اطلاق مہلک نتائج کا پیش خیمہ ہوگا۔ مقامی عدالت کبھی جرم میں مبالغہ آمیزی نہیں کرے گی بلکہ وہ اسے مناسب سطح تک محدود رکھے گی۔" (۱۱)

"ہر کوئی جانتا ہے کہ وسطی ممالک اور مشرق وسطی سے باہر زیادہ تر مسلم ممالک میں خاندانی دشمنیوں کے نتیجہ میں ہونے والے جرائم کا تصفیہ ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کو وٹے میں لڑکی کا رشتہ دیکر کیا جاتا ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ روائتی انداز میں زندگی بسر کرنے والے معاشرے سوسائٹی میں متحارب گروہوں کے عناد کو ہوا دینے کے بجائے کم کرکے توازن کی صورت دینے کو اہمیت دیتے ہیں۔" (۲)

عہد حاضر کے قانونی نظام میں قید کی سزا بھی جرائم میں کمی کے بجائے افزائش کا موجب ہے۔ جیلوں کو اصلاح و تربیت کے مقصد کے تحت قائم کیا جاتا ہے مگر وہ جرائم کی تربیت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ جیل میں نو گرفتاروں کو تجربہ کار استاد میسر آ جاتے ہیں۔ جیل مجرم کو معاشرے سے کاٹ کر تجربہ کار مجرموں کی ہمہ وقتی تحویل میں دے دیتی ہے۔ اگر جیل کے بجائے وہ معاشرے میں رہے، جہاں جرم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو اسکی اصلاح کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ جیل جاکر اصلاح کے یہ امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ جیل میں وہ معاشرتی دباو سے آزاد اپنے جیسے بلکہ زیادہ آزمودہ کار مجرموں کیساتھ شب و روز گزارتا ہے۔ ایسی کوئی مثال حوالے کے لئے بھی پیش نہیں کی جاسکتی کہ کوئی شخص جیل سے سدھر کر نکلا ہو۔ اس لحاظ سے اتنا بھاری بھرکم ادارہ جتنا کہ جیل ہے مکمل طور پر بیکار ثابت ہوا ہے۔ کار نیلیس کے الفاظ میں:

"آج جب کہ دور ایسا ہے کہ دنیا بھر میں عام آدمی کا اپنا گزران حاصل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ارتکاب جرم کے "صلہ" میں قید کی شکل میں اعلی ترین سہولیات کا حصول ارتکاب جرم کا محرک بن گیا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا کہ قید کی سزا جرم کی حوصلہ شکنی کے لحاظ سے مکمل طور پر بیکار ہو گئی ہے کچھ زیادتی ہے۔ مگر اسکے باوجود ذہین آدمی کی طرف سے یہ مطالبہ کہ اسے جیلوں پر اٹھنے والے بے پناہ اخراجات کے بوجھ سے سبکدوش کردیا جائے، بالکل بجا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جیلیں جرائم پر روک

نہیں تو اتنے سارے اخراجات ثابت شدہ سماج دشمنوں کی آسائش کیلئے تو نہیں ہوسکتے۔ البتہ اس سے کہیں کم خرچ اور موثر سزائیں اگر موجود ہوں تو انکو اختیار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ جو پاکستانی کبھی سعودی عرب گیا ہے وہ اس ملک میں امن و سلامتی کے اعلیٰ ترین معیار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہر کوئی اس ذکر سے نہیں تھکتا کہ چوری کے لئے قطع ید کی سزا جو فوری طور پر سرعام نافذ کردی جاتی ہے جرم کے مکمل سد باب کا باعث ہوئی ہے حالانکہ اسکا نفاذ بہت ہی کم مقدمات میں کیا گیا ہے۔ بہت سے جرائم متشددانہ لحاظ سے سماج دشمن نوعیت کے ہیں۔ ان کا سد باب بھی اسی طریقہ سے کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ڈکیتی جسمیں پانچ یا اس سے زیادہ افراد شریک ہوں اور ارتکاب جرم کیلئے تشدد کے ساتھ ساتھ رات کا وقت منتخب کیا گیا ہو جبکہ لوگ دور دراز آبادیوں میں سکون کی نیند سو رہے ہوں اور جسمیں اکثر بیشتر واردات قتل پر منتج ہوتی ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں یہ ضروری نہیں کہ یہ مقصد پاوں کاٹ کر ہی حاصل کیا جاسکے۔ طب اسقدر ترقی کر چکی ہے کہ مجرم کو معمولی جراحت کے نتیجہ میں ہاتھ یا پورے بازو کے استعمال سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ محرومی بغیر جراحت کے بھی ممکن ہے اور اس کا انتہائی دورانیہ بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر جراحت ہی کرنا پڑے تو بھی جنگ میں معذور ہونے والے افراد کی بحالی کے تجربات ایسے افراد کی اصلاح کے بعد بحالی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ بہر صورت سزا پانے والا مکمل معذور ہونے کے بجائے کسی درجہ میں اپنے معمولات انجام دے سکے گا۔ لیکن اگر نافذ شدہ معذوری مکمل بھی ہو تب بھی یہ محض قید کی سزا کے مقابلے پر بہتر ہو گی۔ شعور عامہ مناسب مقدمات میں موت تک کی سزا کا مقتضی رہا ہے۔ سوسائٹی کے تحفظ کیلئے معذوری جیسی مناسب اور منصفانہ سزا اسکے لئے مشکل ہی سے ناگوار ہوگی۔ جبکہ یہ سزا بعض اقسام کے جرائم کے خاتمے کا موجب ہوگی۔"(۱۳)

"مجھے معلوم ہے کہ سزا کا معاملہ بہت سے حلقوں میں غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس مرحلہ پر میری گذارشات بر موقع ہو سکتی ہیں۔ بہر کیف میرا پختہ یقین ہے کہ سزائے قید کے عالمی سطح پر رائج ہونے کے باوجود یہ جرم کے سد باب اور معاشرے کے مفادات کے تحفظ میں موثر ہے اور نہ ہی معقول"۔(۱۴)

لھذا ارتکاب جرم کی پر تشدد کاوشوں کے سد باب کیلئے ہاتھ' بازو یا ٹانگ کو مصنوعی طور پر بیکار بنانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ سزائیں اپنے انذاری اثرات کے لحاظ سے جرائم کا قلع قمع کرنے میں انتہائی موثر ہیں۔ عادی اور پختہ کار جو اپنی سماج دشمنی میں تشدد کو بھرپور طور پر بروئے کار لائے ہوں یہ سزائیں ان کے لئے ہیں۔ ان سزاوں کے بارے میں بعض لوگ خصوصاً افریقی ممالک کے قانون دان اسے دور ظلمت

کی طرف مراجعت قرار دیتے ہیں۔ دراصل اہل افریقہ اپنے طویل اور خاص پس منظر کے تحت ایسا سوچ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے ارباب فکر نے اس بارہ میں میری گذارشات کو قابل غور گردانا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ قید کی سزا اوپر ذکر کردہ جرائم میں تادیبی ہے نہ اصلاحی ہے اور نہ ہی یہ قصاصی اثر رکھتی ہے۔" (۱۵)

" اس مرحلہ پر میں یہ سوال پوچھتا ہوں کہ تحریروں اور دستخطوں کا ماہر جعلساز کے لئے قید کے سزا کس طرح مناسب ہو سکتی ہے؟ وہ قید میں رہتے ہوئے اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ایسے مجرموں کے ہاتھ کا عمدہ توازن مستقل یا عارضی طور پر معمولی جراحت سے ختم کر دیا جائے۔ یہی معاملہ جیب تراش کا ہے۔"(۱۶)

انگلینڈ اور ویلز میں جرائم میں اضافے کی شرح ۴۵ تا ۱۲۰ فیصد ہے۔ جرائم کے بارے میں سروے رپورٹوں کے مطابق نیو یارک میں ایک سال کے دوران ترانوے ہزار وارداتیں ہوئی ہیں۔ اتنے ہی عرصہ میں لندن میں چوری کی دو پونے دو لاکھ وارداتوں کو ریکارڈ پر لایا گیا ہے۔ یہ کیفیت انتہائی متمول معاشروں کی ہے جہاں قانون کا بھرپور احترام بھی پایا جاتا ہے۔

ماہرین قانون کی سڈنی کے مقام پر منعقدہ کانفرنس میں انگلینڈ کے ڈائریکٹر پبلک پراسیکیوشن مسٹر سکلبرن نے اپنے مقالے میں کہا'

"تمام قانونی ضوابط بیگناہ کو سزایابی کے امکان سے تحفظ کے لئے بنائے گئے ہیں۔ مگر اسکا نتیجہ یہ ہے کہ میزان کا پلڑا مشتبہ یا ملزم کے حق میں جھکا ہوا ہے۔کوئی شخص اپنے آپ کو سزاوار ظاہر کرنے کا مکلف نہیں۔' اس اصول کے اطلاق میں مبالغہ جرائم کے خلاف جنگ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا ملزم جو تفتیش یا سماعت میں کسی سوال کے جواب سے انکار یا گریز کرے'عدالت کو اسکے خلاف قیاس کرنے کا اختیار ہونا چاہیے"(۱۷)

اس سیاق و سباق میں کار نیلیس دو اسلامی اصول ہائے قانون کا حوالہ دیتے ہیں:

"میں اس مرحلہ میں مسلم اصول قانون کے دو مسلمہ قواعد کا حوالہ پیش کروں گا۔ جو صورت حال کا بہترین حل ہے۔ پہلا قاعدہ یہ ہے کہ بار ثبوت مدعی پر ہے اور حلف ملزم پر۔ دوسرا قاعدہ یہ کہ جو کوئی اعتراف قصور کرلے اس کے ساتھ سزامیں نرمی برتی جائیگی۔ کامن لا میں ملزم حقائق کی جستجو میں معاونت سی مکمل طور پر مبرا ہے۔"(۱۸)

کتنا فرق ہے دو مختلف نظام ہائے قانون کا۔ کامن لا ملزم کو تفتیش میں اعانت سے استثنی دے دیتا ہے مگر مسلم شخص عقوبت اخروی سے نجات کے لئے رضاکارانہ اعتراف پر اصرار کرکے

سنگساری جیسی سزا خوشی سے قبول کرتا ہے۔

ایک اور فرق بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ نظام میں سزا اور تعزیر کا تعین قانون کرتا ہے جبکہ اسلام میں اس کا اختیار عدالت کو ہوتا ہے۔ عدالت حالات کا لحاظ رکھ کر سزا کی مقدار اور صورت طے کرتی ہے۔ در اصل قانون سازی کے طریقہ کار کا بنیادی فرق ہے۔اسلام کے ہاں قانون سازی پر کسی کو اجارہ حاصل نہیں۔ جو معروف میں جرم ہے اسے قانون جرم قرار دے نہ دے بہر حال وہ جرم ہو گا۔ بہر حال یہ الگ موضوع ہے۔ یہاں اتنا کافی ہے کہ اسلام کی رو سے ہر شخص قانون وضع کرنے کا مجاز ہے۔ وہ اس بارہ میں اپنا نقطہ نظر پیش کر سکتا ہے۔استدلال کی قوت اہل علم سے توثیق حاصل کرکے قانون کا درجہ پا لے گی۔

☆ حوالہ جات ☆

(1) PLD 1965 JOURNAL 149 AT 162
(2) -------- DO------- 159
(3) -------- D0------- 160
(4) PLD 1966 JOURNAL 82 AT 83
(5) PLD 1965 JOURNAL 149 AT157
(6) -------- D0------- 157
(7) -------- D0------- 158
(8) PLD 1966 JOURNAL 82 66
(9) PLD 1965 JOURNAL 149 AT 159
(10) -------- D0------- 159
(11) -------- D0------- 159
(12) -------- D0------- 160
(13) -------- DO------- 161
(14) PDL 1965 JOURNAL 149 AT 162
(15) PLD 1966 JOURNAL 82 AT 8384
(16) PLD 1966 JOURNAL 82 AT 84
(17) ------- DO------- 85
(18) -------- DO------- 85